بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

آج تک دنیا میں جتنی بھی اصلاحی تحریکیں اُبھری ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جسے خلا میں کام کرنے کا موقع میسر آیا ہو۔ ہر تحریک ایک مخصوص معاشرتی ماحول، ایک خاص سیاسی نظام، ایک خاص نوعیت کے معاشی حالات، اور افکار و نظریات اور معتقدات کی ایک خاص فضا میں جنم لیتی ہے۔ اِس بنا پر اُسے ہر مرحلے پر مختلف قسم کے موانع پیش آتے ہیں۔ اُس کی راہ روکنے کے لیے مخالفین مختلف بنیادوں پر تحیے بندیاں کرتے اور مختلف نوعیت کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ دنیا کی جو تحریک جتنی زیادہ جاندار، انقلاب انگیز اور رائج الوقت نظام میں جتنی زیادہ بنیادی تبدیلیاں کرنے کا عزم لے کر اٹھے گی اسی نسبت سے اُس کی مخالفت بھی زیادہ ہوگی اور اُس کے معاندین ایک ایک قدم پر اس کے خلاف پُوری قوت سے صف آرا ہو کر اُسے شکست دینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک کمزور اور نحیف سی تحریک جس کی مخالفت پر پُوری قوم اور پُورا ملک کمربستہ ہو، اُسے آخر اثر و نفوذ کا راستہ کیونکر مل جاتا ہے۔ اور وہ کس طرح ایک غالب قوت بن کر پُورے معاشرے پر چھا جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی حیات آفریں تحریک خارجی وسائل اور خارجی قوت کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہوتی اور اگر وہ وقتی طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ مستقل اور دیرپا کامیابی کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ وہ جس معاشرے میں کام کر رہی ہے اسی معاشرے کے اندر اپنے لیے قوت اور توانائی کا سرچشمہ فراہم کرے۔

اس ضمن میں ہمیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کسی تحریک کی مخالفت میں کون کون سے لوگ پیش پیش ہوتے ہیں اور کس قسم کے افراد اُس کے لیے قوت و طاقت فراہم کرتے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں نفسیات بالخصوص اجتماعی نفسیات اور معاشرت کے ماہرین نے اس سلسلے میں جو تجزیے اور نتائج پیش کیے ہیں وہ بڑے معلومات افزا ہیں مخالفین میں سب سے پہلے وہ گروہ سامنے آتا ہے جو کسی نئی تحریک کی مخالفت مفادات کی بنا پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر کرتا ہے۔ یہ گروہ خلوص کے ساتھ مروجہ نظام کو صحیح اور کسی نئے نظام کی دعوت کو غلط سمجھتا ہے اس لیے یہ آخر وقت تک اس کی راہ روکتا ہے لیکن اُس کے اس طرز عمل میں کوئی دنیوی مصلحت یا غرض کار فرما نہیں ہوتی بلکہ یہ اُس کے ضمیر کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ گروہ اپنے نظریات میں بڑا مخلص اور اپنے عمل میں بڑا پختہ ہوتا ہے اور اگر یہ نئی تحریک کے دلائل سے مطمئن ہو کر اس میں شامل ہو جائے تو اُس کے لیے بڑی قوت کا باعث بنتا ہے۔ یہ گروہ اگرچہ مخالفت میں بڑی پامردی دکھاتا ہے لیکن کبھی گھٹیا حربے استعمال نہیں کرتا۔ اصول کی جنگ کو شرافت اور خودداری کے ساتھ لڑتا ہے اور فتح و شکست دونوں صورتوں میں اپنے دماغی توازن کو بگڑنے نہیں دیتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں اس گروہ کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی ہے اور یہ کسی سوسائٹی میں بھی ایک دو فی صد سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔

معاندین کا دوسرا طبقہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے مفادات کسی مروجہ نظام سے وابستہ ہوں اور وہ ان مفادات کی حفاظت کے لیے ہر نئے نظام کی راہ روکتے ہوں۔ اس طبقے کی مخالفت اصول کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ محض اغراض کی خاطر ہوتی ہے۔ یہ طبقہ بڑا مفاد پرست اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انتہائی بودا ہوتا ہے اور نئی تحریک کو شکست دینے کے لیے تمام جائز و ناجائز طریقے استعمال کرتا ہے۔ اس طبقے میں بہت سے مختلف گروہ شامل ہوتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلا گروہ اُونچے سرکاری عہدیداروں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اقتدار کے ساتھ وابستگی کی بنا پر کسی معاشرے یا ملک کی اجتماعی قوت کے مالک بن جاتے ہیں اور پھر اپنی اس قوت کو قوم کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ اپنے عہدوں کو قائم رکھنے اور اپنے اقتدار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مروجہ نظام

کی حمایت میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے معاشی مفادات ایک خاص نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی ساری شاہ خرچیاں اور عیش پرستیاں رائج الوقت نظام کی رہین منت ہوتی ہیں اس لیے وہ اس کی بقا کے خواہاں اور آرزومند رہتے ہیں۔

تیسرے گروہ میں وہ بے فکرے افراد شامل ہوتے ہیں جن کی کسی نظام سے وابستگی کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتی کہ نیا نظام جو اخلاقی پابندیاں عائد کرنے کا دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے اور جس ایثار کا اُن سے مطالبہ کرتا ہے وہ اُسے پورا نہیں کر سکتے۔ اور اس کے مقابلے میں مروجہ نظام اُن کی اخلاق سوز حرکات کے لیے انہیں کھلی چھوٹ دے دیتا ہے، بلکہ بعض حالات میں اُن کا پشت پناہ بنتا ہے۔

پھر ایک گروہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو کسی نظام کو محض اس بنا پر قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے تحت تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُن کے مزاج کو اس سے گہری مناسبت ہو جاتی ہے۔ اُن کی فکر و نگاہ کے زاویے اس کے عین مطابق اور اُن کے جذبات و احساسات اُس کی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتے کہ قلب و نگاہ یا مزاج اور سیرت کی کسی تبدیلی کو گوارا کریں۔ اس لیے وہ بہتے ہوئے دھارے کے رُخ پر ہی گامزن رہنا پسند کرتے ہیں۔

جو طبقے کسی نئی اُبھرتی ہوئی تحریکِ اصلاح کے لیے سب سے پہلے قوت و طاقت فراہم کرتے ہیں اُن میں سب سے نمایاں مقام اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اُس تحریک کے نظریات کو دل و جان سے قبول کر کے اس راہ کی مصیبتوں، مزاحمتوں اور دشواریوں کو جانتے ہوئے اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس طبقے کو بھی مختلف گروہوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

ایک گروہ اُن معدودے چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں وقت کے غالب نظام میں قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ نئی تحریک کے اصولوں کے قائل ہونے کی وجہ سے اپنے سارے مفادات کو خود ٹھکرا کر مصائب کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس گروہ میں بڑی پختہ سیرت و کردار کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ مگر

ان کی تعداد ہر دور میں بڑی قلیل رہی ہے۔

اس کے بعد اُن لوگوں کی باری آتی ہے جن کے مروجہ نظام سے قطعاً کوئی مفادات وابستہ نہیں ہوتے بلکہ اس نظام کی قہرمانیوں کے وہ ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور اس بات کی آرزو کرتے ہیں کہ کسی طرح ان سے انہیں نجات ملے۔ یہ افراد بڑے اخلاص اور سچے جذبے کے ساتھ نئی تحریک کی قدر کرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ زیادہ باہمت اور جری ہوتے ہیں وہ کھل کر میدان میں آجاتے ہیں۔ مگر جو کمزور ہوتے ہیں وہ چھپ کر اسے تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دنیا کی کوئی دعوت اور کوئی تحریک بھی اپنے ان مخالفین اور موافقین کے موقف اور ان کی قوت و طاقت کو پوری طرح سمجھے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی دعوت کے علمبرداروں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اُن کی راہ میں کونسے سنگِ گراں حائل ہیں اور اُن کی قوت و طاقت کے سرچشمے کہاں کہاں ہیں، اس وقت تک وہ کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اس بنا پر ان سارے طبقوں کے مزاج، ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ آج جو لوگ دنیا میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوشاں ہیں انہیں مقصد کے واضح شعور اور نصب العین کی سچی اور گہری لگن کے ساتھ یہ حقائق بھی پوری طرح معلوم ہونے چاہییں کہ کونسے گروہ اور طبقے اُن کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑے ہونگے اور کونسے لوگ ان کی تقویت کا ذریعہ بنیں گے۔

دعوت خیر کی مخالفت اور موافقت میں اُٹھنے والے مختلف طبقے دورِ جدید کی پیداوار نہیں ہیں۔ انسان نے جس روز سے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہے اسی وقت سے یہ دونوں قسم کے عناصر انسانی معاشرے میں موجود رہے ہیں۔ البتہ اب ایک فرق یہ ضرور واقع ہوا ہے کہ مخالف طبقوں اور گروہوں کا دباؤ اور اُن کے اثر کا دائرۂ کار اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی نظیر پہلے کہیں نہیں ملتی۔ کُلیت پسند ریاستوں کے اندر تو یہ دباؤ فطری طور پر زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ مگر جمہوری معاشروں میں بھی یہ دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ سطح بین آنکھیں اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ اور پھر اس کی نوعیت اتنی پیچیدہ اور اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ ایک قدم

بھی سخت مزاحمت کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مختلف مراحل اور منازل کا تو ذکر ہی کیا، یہاں تو ایک ایک انچ پر پوری قوت سے راستہ مسدود کیا جاتا ہے اور شدید کشمکش اور سخت محنت کے بعد ہی کہیں آگے بڑھنے کی راہ ملتی ہے۔ کسی تحریک کی مزاحمت میں جو یہ غیر معمولی شدت اور قوت پیدا ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی ایجادات اور اکتشافات نے انسان کو بہت زیادہ توانائی عطا کر دی ہے۔ پھر حمل ونقل اور رسل ورسائل کے جدید ذرائع نے ان مختلف قوتوں کو مجتمع کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں انسان کی معاونت کی ہے۔ چنانچہ اب مخالف قوتیں زیادہ قوت کے ساتھ کسی تحریک کے راستے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

ان صفحات میں ہم اُن قوتوں کا جائزہ لیتے ہیں جو نہ صرف یہاں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کی راہ میں مزاحم ہیں۔ جدید سیاست اور معاشرت کی اصطلاح میں ان قوتوں کو فشاری گروہ (PRESSURE GROUPS) یعنی مخالفت میں دباؤ ڈالنے والے گروہ کہا جاتا ہے

اسلام کے معاندین کے متعدد گروہوں میں سب سے نمایاں گروہ اُن لوگوں کا ہے جو جدید تہذیب کے دل وجان سے فدائی ہیں۔ اسی کے اساسی تصورات کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی کے اصولوں کی صحت کے وہ قائل ہیں اور اس بات کا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی تہذیب میں انسانیت کی فلاح وکامرانی کا راز مضمر ہے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اتنے باہمت اور صاحبِ عزم نہیں ہیں، نہ اتنی قابلیت رکھتے ہیں کہ دلیل کے زور سے مسلمانوں کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل کر سکیں، اس لیے ان کا طریقہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسندِ اقتدار حاصل کرکے درپردہ اپنے افکار ونظریات کا پرچار کریں اور جہاں جہاں مغربی اقدارِ حیات کے عملی نفاذ کے مواقع حاصل ہوں، وہاں انہیں زبردستی نافذ کر دیں۔ یہ گروہ اسلام کی راہ چار طریقوں سے روکتا ہے:

پہلا طریق یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں مختلف شکوک وشبہات پھیلائے جائیں۔ اسلام نے ہمیں معتقدات، اعمال اور اخلاق کا جو جامع نظام دیا ہے اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی جائیں۔ خصوصاً اسلامی تعلیمات کے وہ حصے جو مغربی تہذیب سے براہِ راست متصادم ہیں اُن پر تو دل کھول کر ے دے کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب ان اجزا کے متعلق لوگوں کے اندر غلط اور ناقابلِ عمل ہونے کا تصور بیٹھ جائے گا

تو پھر باقی نظام پر بھی اُن کا اعتماد باقی نہ رہے گا اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ دین کسی قادرِ مطلق اور علیم و خبیر ہستی کی طرف سے راہِ ہدایت نہیں بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا ایک نظام ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی نظر میں بے وزن بنانے کے لیے جو مسائل اُبھار رہا ہے اُن کی نوعیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب کے سب وہی ہیں جو مغربی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ تعددِ ازواج، ثقافت، پردہ، تحدیدِ نسل، سُود اور قومی ملکیت کے علاوہ کونسا مسئلہ ہے جس پر ان لوگوں نے کبھی اظہارِ خیال کیا ہو۔ تمام مسلم ممالک میں یہی چند گنے چُنے مسائل موضوعِ سخن بنے ہوئے ہیں۔

اس گروہ کے کچھ لوگ اسلام کی مخالفت کے لیے دوسرا حربہ یہ استعمال کرتے ہیں کہ عوام کو ہر لحہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کا دین تو بالکل صحیح اور مغربی تہذیب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، البتہ ملّا اس کی جو تعبیر کرتا ہے وہ ایسی ہے کہ خواہ مخواہ تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور ہمیں یہ احساسِ ندامت ہونے لگتا ہے کہ ہم کسی دُور ازکار دین کے ماننے والے ہیں۔ اس بنا پر یہ طبقہ اسلام کی نہایت ہی عجیب و غریب تاویلات پیش کرتا ہے اور قرآن و سنت کی نہایت واضح، ٹھوس اور محکم تعلیمات کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوگ یہ مذموم دھندا کر رہے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دین کی راہ روکنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں جب یہ بات بیٹھ جائے گی کہ صحیح اور غلط کا معیار صرف مغرب ہے اور اُن کا دین اس وجہ سے برحق ہے کہ اس کی تعلیمات مغربی معیار پر پوری اُترتی ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے ذہن اس بات کی طرف منتقل ہو جائیں گے کہ جدید اقدار کے لیے آخر وہ کیوں ایک قدیم کتاب اور پُرانی سُنّت ہی کی طرف رجوع کریں، سیدھی طرح اُن اقدار ہی کو کیوں نہ اپنا لیں جو خوب و ناخوب کا اصل معیار ہیں۔

پھر اسی گروہ سے تعلق رکھنے والے کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اصول و نظریات کی بحث کے جھگڑے میں نہیں پڑتے بلکہ معاشرے میں عملاً دین سے بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اسلام غلط ہے یا اس کے اصولوں میں کوئی خامی اور سقم ہے بلکہ عمل کے میدان میں مسلمانوں، خصوصاً اُن کی نوخیز نسلوں

کو ان راہوں پر چلا دیتے ہیں جہاں جلدی ہی ان کی متاعِ ایمان چھن جاتی ہے۔ الہامی مذاہب کا سارا دارومدار نفس کی پاکیزگی اور سیرت کی پختگی پر ہوتا ہے۔ جب ایک مرتبہ انسان نفس کی غلامی اختیار کرکے اخلاقی ضابطوں کو توڑنے لگے تو پھر وہ اور جو کچھ بھی ہو جائے، دینی نقطۂ نظر سے کسی کام کا نہیں رہتا۔ اب اس گروہ کی سرگرمیوں کا محور یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح نوجوانوں کے اندر اخلاقی حس کو ختم کیا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ مذہب نے تمہاری نفسانی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں جو پابندیاں لگا رکھی ہیں یہ بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں تمہیں جلدی توڑ ڈالنا چاہیے ورنہ تم ذہنی اور جذباتی عوارض کے شکار ہو جاؤ گے۔ اس طبقے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر اس ہنگامے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں اخلاقی آوارگی کے رجحانات کو تقویت حاصل ہو۔ مخلوط تعلیم، مخلوط مجالس، بے پردگی کی حوصلہ افزائی، رقص و سرود کی محفلوں کا قیام، طرح طرح کے جشن۔ سب اسی طبقے کی کارفرمائیاں ہیں۔ نوجوانوں پر یُوں بھی جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب سفلی جذبات کو بھڑکانے کے سارے سامان موجود ہوں اور برسرِاقتدار اور اونچے طبقے عملی طور پر اخلاق سوز تحریکات کی پشت پناہی کر رہے ہوں تو نوخیز نسلیں جلد ہی آبرو باختہ ہو کر نفس پرستی کا شیوہ اختیار کر لیتی ہیں۔

جب ہم اسلام دشمن قوتوں کی کامیابی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہیں سب سے زیادہ اسی محاذ پر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اعتبار سے یہ لوگ مسلمانوں کو بالعموم مغربی تہذیب کا غلام نہیں بنا سکے۔ ان کی تجدد پسندی کے کارنامے بھی مسلم عوام میں مقبول نہیں ہو سکے۔ البتہ نوجوانوں کا مزاج بگاڑنے اور انہیں عیش پرستیوں کا خوگر بنانے میں ان کی کوششیں کافی حد تک بارآور ہوئی ہیں۔

اسلام کا یہ دشمن گروہ کس کس جگہ پایا جاتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اصل مسکن ایوانِ اقتدار ہے یا اس کے سائے میں بعض دوسرے مراکز۔ یہ مسلم قوم کا تاریخی المیہ ہے کہ وہ بگڑے ہوئے اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں ایک مدتِ دراز سے بے بس چلی آ رہی ہے۔ میں یہاں ماضی کی تاریخ دہرانا نہیں چاہتا۔ حال ہی میں اس کا جس طرح تسلط قائم ہوا ہے صرف اُسے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مسلمان ممالک جب اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے مغربی استعمار کے سامنے سرنگوں ہوئے تو غیر ملکی استعمار نے اپنے غلبے کے

بقا کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے اندر سے ایک ایسا گروہ تلاش کیا جائے جسے دنیوی مفادات دنیا کی ہر دوسری چیز سے عزیز تر ہوں۔ پھر ان میں سے بھی اُن لوگوں کو ترجیح دی گئی جن کے ذہنوں پر مغربی تہذیب کی برتری کا نقش گہرا ثبت ہو گیا ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کی وفاداریاں مغربی استعمار کے لیے زیادہ قابلِ اعتماد تھیں۔ اس لیے یہ گروہ غیر ملکی اقتدار کے سائے میں قوت حاصل کرتا رہا اور صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اسے اگرچہ عوام میں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہوتی مگر امُورِ مملکت میں اُسے ہمیشہ بہت زیادہ دخل حاصل رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب مغربی اقوام مسلم ممالک سے سیاسی تسلط ختم کرنے پر مجبور ہوئیں تو وہ جاتی دفعہ زمامِ اقتدار اس گروہ کے ہاتھ میں سونپ گئیں تاکہ وہ ان کی غیر حاضری میں ان کی جانشینی کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا رہے۔ اِدھر یہ گروہ بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ اسے معاشرے میں جو قوت حاصل ہے اس کی وجہ اس کی ذاتی عظمت یا اہلیت نہیں بلکہ محض اقتدار ہے۔ اس لیے اس نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسندِ اقتدار پر براجمان رہے اور پھر اقتدار کے لامحدود ذرائع سے کام لے کر اپنے دلپسند افکار کو عوام میں پھیلائے۔ اس گروہ کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ اگر مسلم ممالک میں اسلامی نظام نافذ ہو گیا تو اسے دولت سمیٹنے اور اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے اور اپنے نظریات کو معاشرے کے اندر پھیلانے کے مواقع حاصل نہ رہیں گے۔ صرف اقتدار کی بدولت ہی اسے معاشرے میں قوت و طاقت حاصل ہے اور وہ فکری لحاظ سے بھی اپنی قیادت کی دکان اسی ذریعہ سے چمکا سکتا ہے۔ اگر مسلم ممالک میں دین غالب ہو جائے تو پھر لامحالہ وہی لوگ آگے آئیں گے جو دینی نقطۂ نظر سے مملکت کے معاملات چلانے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت رکھتے ہوں اور ذہنی اور فکری قیادت بھی اُن حضرات کے ہاتھ میں ہو گی جو گہری دینی بصیرت کے حامل ہوں۔ اس حالت میں اگر یہ لوگ اپنی قیادت برقرار رکھنا چاہیں گے تو انہیں فکری اور اخلاقی لحاظ سے خود اپنے آپ کو بدل ڈالنا ہو گا جسے یہ اپنے حق میں موت سے بدتر سمجھتے ہیں۔

اس طبقے میں پھر دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہے اور وہ دنیائے اسلام کو انگلستان، امریکہ اور فرانس کی صورت میں دیکھنے کا آرزومند ہے۔ دوسرا طبقہ اشتراکیت کا

معتقد ہے اور وہ مسلم ممالک کو روس یا چین کا نمونہ بنانا چاہتا ہے۔ جہاں تک مغربی دنیا کا تعلق ہے، اس کے اندر تو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان سخت جاں گسل کشمکش برپا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اسلامی ملکوں کے معاملہ میں مغربی بلاک اور اشتراکی بلاک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوب تعاون کر رہے ہیں، حتیٰ کہ مغربی بلاک نے شرقِ اوسط اور جنوبی عرب کو خود روس کی گود میں پھینکا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دلچسپ منظر بھی دیکھ رہے ہیں کہ خود مسلم ممالک میں بھی مغربی نظریات رکھنے والے عناصر اور اشتراکیت کے حامی اسلام کے مقابلے میں پوری طرح متحد ہیں اور ایک دوسرے کے ہم رکاب ہو کر کام کر رہے ہیں۔ یہاں روسی اشتراکیت، چینی اشتمالیت اور سرمایہ دارانہ الحاد سب مل کر اسلام کے خلاف صف آرا ہیں اور ان کی صفوں میں اس محاذ پر کوئی اختلاف نظر نہیں آتا بلکہ پورا پورا تعاون پایا جاتا ہے۔ تعلیم گاہوں میں اسلام کی حمایت کیجیے تو ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے مگر ماؤ کی لال کتاب اور ماؤ کی تصویر کے تمغے آزادی سے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ مقابلے کے امتحانات میں ایک امیدوار کی بے دینی خواہ سرخ ہو یا سفید یا زرد، ہر حال میں یکساں قابلِ قبول ہے، مگر مسلمان ہونے کی ابتدائی علامات بھی اس میں پائی جائیں تو بالاتفاق اسے نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ پریس اور اطلاعات اور نشریات کے شعبوں میں مغربی بلاک کے حامیوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے سرخوں کو نفوذ کا پورا موقع دیا ہے۔ یہی حالت ان اخبارات کی بھی ہے جنہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ دونوں گروہوں کے صحافی ان میں پورے اتحاد و تعاون کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ کھلی کھلی علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اسلام کے خلاف دونوں کا مفاد مشترک ہے اور اس معاملہ میں ان کے درمیان درحقیقت کوئی نزاع نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کی محبت مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتنی گہری پیوست ہے اور اسلامی نظام کے ساتھ اُن کا جذباتی لگاؤ اتنا شدید ہے کہ جب تک پوری قوت مجتمع کر کے اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اس وقت تک اس کی جڑوں کو اکھیڑا نہیں جا سکتا۔ اس لیے اس مرحلے پر دونوں طبقوں میں پوری پوری یگانگت ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے اس محاذ کو مضبوط بنانے کے لیے ان تمام چھوٹی بڑی قوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے جو کسی طرح بھی اسلامی نظام

کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اس وقت ان کی کوششوں کا ہدف صرف یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح اپنے مرکز ثقل سے ہٹ جائیں۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ وہ اس مقام سے سرک گئے تو پھر انہیں کسی بھی سمت میں بڑی آسانی کے ساتھ دھکیلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ان طبقوں میں اُن تمام افراد اور گروہوں کی پذیرائی کی جاتی ہے جن کے افکار و نظریات میں لادینی اقدار کی جھلک ہو یا جو امت کے اجتماعی تصورات سے مغایرت رکھتے ہوں اسی اصول کے تحت ہر اسلامی ملک میں اس وقت ہر گراہی کی سر پرستی ہو رہی ہے۔ جو گروہ بھی کسی نہ کسی طرح دین کا حلیہ بگاڑنے، یا اہلِ دین کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کام کر رہا ہو، اسے نہ صرف اپنے افکار پھیلانے کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں بلکہ حکومت اپنے ذرائع سے بھی ہر طرح اس کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

اسلام کی راہ روکنے والا یہ سب سے مؤثر طبقہ مزاحمت کے لیے متعدد محاذ کھولتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ تو براہِ راست حکومت کے اندر گھس کر اور وہاں اثر و رسوخ پیدا کر کے دینی قوتوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے دباتا ہے اور دوسرا گروہ عوام کے اندر مختلف حیلوں بہانوں سے اثر و نفوذ پیدا کرتا ہے جس ملک میں آمرانہ نظام قائم ہو وہاں تو اسے کام کرنے کے نہایت ہی اچھے مواقع میسر آتے ہیں۔ ایک ایسی حکومت جو عوامی آرزوؤں اور تمناؤں کی ترجمان نہ ہو اور ایک فرد یا چند افراد یا ایک مخصوص گروہ کی خواہشات کی مظہر ہو، وہ اپنے تسلط کے لیے ہر مرحلہ پر انتظامیہ کی محتاج رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس ملک میں نوکر شاہی کو غیر محدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ جس نہج پر چاہتی ہے ملک کو چلاتی ہے ملک کی پوری آبادی اس کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتی ہے، عوامی خواہشات کے علی الرغم مسندِ اقتدار پر قابض ہونے والوں کو اس بات کی فکر سب سے زیادہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اقبال مندی، مقبولیت اور محبوبیت کی خوش کُن خبریں سُنتے رہیں۔ اسلام کا مُعاند طبقہ ان کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ انہیں ہر وقت ان کی ہر آن بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کے افسانے سنا سنا کر مطمئن اور مسرور رکھتا ہے اور انہیں یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ یہاں اگر کوئی اُن کا بدخواہ ہے تو یہی دین کے رجعت پسندانہ نظریات رکھنے والا گروہ ہے۔ باقی ہر شخص اُن کی ترقیات اور اُن کی عظمت کا دل سے معترف ہے اور اس بات کا آرزو مند

ہے کہ ان جیسے بالغ نظر اور خیر خواہ حکمران قیامت تک مسندِ اقتدار کی زینت بنے رہیں۔ یہ نوکر شاہی طبقہ حکمرانوں کی کسی مخلصانہ محبت اور عقیدت میں یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنے مفادات کی خاطر اس روش کو اپناتا ہے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت عوامی احساسات کی ترجمان ہو تو پھر اُسے عوام کا خادم بنے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن موجودہ صورت میں اگر وہ مدح و ستائش کے ذریعے آقائے ولی نعمت کو خوش رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے اور کسی میں یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ اُس کا ہاتھ روکے۔ یہ گروہ بالکل بے خوف ہو کر لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہوتا ہے اور انہیں اپنے ظلم کا تختۂ مشق بناتا ہے مگر اس کے ساتھ وہ ہر لمحہ اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ حکمران گروہ کو عوامی احساسات سے زیادہ سے زیادہ بے خبر رکھا جائے اور ملک کے حالات اور عوام کے جذبات خواہ کچھ بھی ہوں مگر اُسے یہی باور کرایا جائے کہ حضور کا اقبال دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ یہ طبقہ حکمرانوں کو ہر وقت اس طرح گھیرے میں رکھتا ہے کہ انہیں ان کی وساطت کے بغیر کوئی خبر ملتی ہی نہیں اور وہ جلدی ہی اپنے آپ کو اس کے ہاتھ میں بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسندِ اقتدار سنبھالنے والے آخر کار برائے نام حکمران بن کر رہ جاتے ہیں اور اقتدار کی اصل قوت اس نوکر شاہی طبقے کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس قوت کو پھر یہ طبقہ بڑی عیاری کے ساتھ دین کے خلاف استعمال کرتا ہے۔

دینِ حق کا یہ مخالف طبقہ عوام کے اندر بھی اسلام کے خلاف مختلف قسم کے محاذ قائم کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی الحاد و بے دینی کے فلسفے پھیلاتا ہے اور عقائد و احکام میں شکوک برپا کرتا ہے۔ اس کا رُخ ہمارے تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف ہوتا ہے۔ کوئی مذہبی گمراہیاں پھیلاتا ہے اور اس کے شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین کا علم تو نہیں رکھتے مگر اس سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں۔ کوئی اخلاقی بگاڑ پھیلانے میں سرگرمی دکھاتا ہے اور اس کے ہدف خاص طور پر ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) ہوتے ہیں۔ کوئی مزدوروں کا خیر خواہ بن کر سامنے آتا ہے اور انہیں طبقاتی جنگ کی طرف دھکیلتا ہے۔

کوئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رُخ کرتا ہے اور وہاں طلبہ کو گمراہ کرتا ہے۔ لیکن اس طبقہ کے حربوں میں سے سب سے زیادہ گھٹیا اور ذلیل حربہ یہ ہے کہ وہ دینِ حق کی خاطر جد و جہد کرنے والوں کے خلاف جھوٹے پروپگنڈے کا ایک طوفان برپا کرتا ہے۔ اور اس افترا پردازی کی مہم کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس ناپاک کام میں اس کے آلۂ کار وہ لوگ بنتے ہیں جو اپنے آپ کو علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذریعہ سے دینی تحریک اور اس کے علمبرداروں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اُن پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات عائد کیے جاتے ہیں اور عوام کو یقین دلایا جاتا ہے کہ دین کو اصل خطرہ فساق و فجار سے نہیں، لادینی کے علمبرداروں سے نہیں، مغربی تہذیب کے پھیلانے والوں سے نہیں، اشتراکیت کے داعیوں سے نہیں، باہر سے آنے والی اور خود ملک کے اندر سے اٹھنے والی کسی گمراہی سے نہیں، خطرہ ہے تو صرف اُن لوگوں سے جو دین کو پُورے نظامِ زندگی کی حیثیت سے غالب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس طبقے کے وہ عناصر جو ایوانِ اقتدار میں گھسے ہوئے ہیں، وہ حکومت کو دینی تحریکات کے علمبرداروں کے خلاف برانگیختہ کرتے ہیں اور مسندِ اقتدار پر متمکن افراد کو یہ خوف دلاتے ہیں کہ یہ لوگ تمہاری گدی چھین لینا چاہتے ہیں، اس بنا پر یہ تمہارے سب سے بڑے دشمن ہیں جن کا انہیں جلد از جلد قلع قمع کرنا چاہیے۔ عوامی احساسات سے بے خبر اور صحیح صورتِ حال سے غافل حکمراں ان کے فریب میں آکر ظلم و ستم ڈھانا شروع کرتے ہیں اور اس سے اُن کے خلاف عوام کے اندر بیزاری کے جو جذبات پھیلتے ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یہ بے دین طبقہ اربابِ اقتدار کو یقین دلاتا ہے کہ تمہارے اقتدار کے لیے اگر کوئی سہارا ہے تو وہ بس ہماری ذات ہے۔

انڈونیشیا، مصر، شام میں اسی انداز سے یہ دشمنِ دین طبقہ اسلام کی راہ میں مزاحم ہوا ہے اور پاکستان میں بھی اس نے یہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ حکومت کے ایوانوں میں اسے پوری رسائی حاصل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ امورِ مملکت اسی کے منشا کے مطابق چلائے جا رہے ہیں تو یہ بات زیادہ صحیح ہو گی۔ حکمرانوں کے مزاج میں بہت زیادہ دخیل ہونے کی وجہ سے وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کر دیتا ہے۔ دوسری طرف عوام کے اندر بھی اسے رسوخ پیدا کرنے کے پورے مواقع دیئے جا رہے ہیں۔

مزدوروں میں کام کرنے کا گویا اسے اجارہ ملا ہوا ہے۔ طلبہ کو خراب کرنے کی بھی اسے کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ نشرواشاعت کے تمام ذرائع بھی اب زیادہ تر اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے مقابلے میں دین کے لیے کام کرنے والے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی جو صورت بھی اختیار کرتے ہیں اس پر فوراً خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے اور پوری انتظامی مشینری ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے حرکت میں آجاتی ہے۔

یہ سب تجربات اس سے پہلے متعدد مسلم ممالک میں ہو چکے ہیں اور قریب کے زمانے میں ان کے بدترین نتائج بھی دیکھے جا چکے ہیں۔ اسرائیل جیسی چھوٹی ریاست کے مقابلے میں کئی کئی عرب ریاستوں کے بیک وقت شکست کھا جانے کا سبب آخر اس کے سوا کیا تھا کہ ۲۰ سال تک اسرائیل یہودی قومیت کی اصل بنیادوں پر اپنی طاقت کی تعمیر کرتا رہا اور دوسری طرف عرب ریاستوں میں اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کی جاتی رہیں۔ ایک بیرونی تہذیب اور بیرونی فلسفۂ حیات کو لاکر زبردستی مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی رہی اور جن لوگوں نے بھی اسلام کے احیاء کیلیے کوئی کوشش کی انہیں کچلنے کے لیے ساری طاقتیں خرچ کی جاتی رہیں۔ اس کا جو عبرتناک انجام جون ۱۹۶۷ء میں ساری دنیا کے سامنے آیا ہے اس کے بعد بھی اگر کچھ مزید مسلمان ملک یہی تجربہ دہرانا چاہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔

یہ تو ہے اس طبقہ کا معاملہ جو دعوتِ خیر کا اصل مدِ مقابل ہے۔ مگر اسلام کے خلاف اس سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور طبقے کے علاوہ کچھ دوسرے طبقات بھی دین کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم طبقہ سرمایہ داروں اور دولتمندوں کا ہے، خصوصاً وہ سرمایہ دار اور دولت مند جن کی دولت حکومت کی غلط بخشیوں کا نتیجہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے اندر چونکہ طلب کے مقابلے میں اشیاء کی رسد بہت کم ہوتی ہے اور جن لوگوں کو بھی رسد کی آسانیاں حاصل ہو جائیں وہ برسوں میں نہیں بلکہ دنوں میں دولت کی غیر معمولی مقدار سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اس لیے یہاں ہر شخص کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حکومت اُسے دولت سمیٹنے کی زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچائے اور پھر حصولِ دولت کے ناجائز طریقوں میں اس کا قطعاً احتساب نہ کرے۔ درحقیقت دولت پرستی کے اس بڑھتے ہوئے جنون نے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو بے ضمیر بنا دیا ہے

اور مال و متاع کی خاطر یہ لوگ ہر حکومت کی خوشامد اور اُس کے ہر جائز و ناجائز فعل میں اُس کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ دورِ جدید میں یُوں بھی صنعت و تجارت کے سارے معاملات میں حکومتیں کافی حد تک دخیل ہو گئی ہیں۔ لیکن خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں تو کاروبار کا اکثر و بیشتر حصہ لائسنسوں، پرمٹوں، اور اسی نوعیت کی دیگر مراعات سے وابستہ ہوتا ہے، اس لیے ایسے ممالک میں معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں جو شخص بھی ذرا وسیع پیمانے پر تجارت یا کاروبار کرنا چاہتا ہو وہ حکومت کی چشم التفات کا محتاج ہوتا ہے اور وہ اُس کی برہمی کو ایک ثانیہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں نے اس صورتِ حال سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس ذریعہ سے عوام کو طالع آزمائی، موقع پرستی اور بے ضمیری کی خوب تربیت دی ہے۔ اس طرح دولت پرستی کے جنون نے بکثرت لوگوں کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا ہے اور وہ ہر اُس نظام کا ساتھ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو ان کی اس معاملے میں معاونت و دستگیری کر سکے۔

پھر دولت پرستوں کے اندر بھی دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کو ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت نے عیش پرستیوں کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اس طبقہ کو ہمیشہ ایک ہی فکر لاحق رہتی ہے کہ حکمرانوں کی مدح و ستائش کر کے زیادہ سے زیادہ لائسنس اور پرمٹ حاصل کیے جائیں اور بغیر کسی محنت کے مال و متاع کی ایک کثیر مقدار جمع کر کے اُسے عیاشیوں پر اڑایا جائے۔ اس طبقے کو اسلام، اخلاق، ضمیر کسی چیز سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے نفس کی لذتوں کے لیے دولت چاہیے۔

دوسرا مختصر سا طبقہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو کچھ نہ کچھ دینی ذہن بھی رکھتے ہیں، اسلام کے شعائر کی عزت بھی کرتے ہیں، اور کسی حد تک اسلام کے بنیادی ارکان کے پابند بھی ہوتے ہیں، مگر دولت کی محبت میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے حکومت کی نظر عنایت ان سے پھر جائے اور اُن کی آمدنی کے ذرائع میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ اس طبقے کو بھی پہلے طبقے کی طرح لائسنس اور پرمٹ کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے اور اس کی خاطر وہ حکومت کے ہر جائز و ناجائز کام میں اس کی معاونت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ

جب ان لوگوں کے اندر مذہبی حس بیدار ہوتی ہے تو یہ مساجد کی تعمیر، عربی مدارس کے قیام اور ان کی اعانت، اور غریبوں اور بیواؤں کی امداد کے لیے کچھ صدقات بھی دے دیتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے دینی کام کا ساتھ وہ کبھی نہیں دیتے جس سے اُن کی ناجائز آمدنیوں پر زد پڑنے کا خطرہ ہو۔ حکمراں طبقے کو بھی جب اپنی مصلحتوں کے تحت کسی دین دار گروہ کی حوصلہ افزائی مقصود ہوتی ہے تو وہ بھی انہی لوگوں سے اس کی اعانت کراتا ہے تاکہ براہِ راست سرکاری مدد سے کہ اس کی پوزیشن مشتبہ نہ ہونے پاتے، اور اپنا دینی بھرم قائم رکھتے ہوئے وہ حکمران طبقے کی خدمت زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے۔

اس گروہ کے بلاشبہ کچھ فائدے بھی ہیں۔ مساجد اور مدارس کا نظام انہی کی فیاضیوں سے چل رہا ہے لیکن اس طبقے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے اسلام کا ہمہ گیر تصوّر مجروح ہوتا ہے جن لوگوں کو دین سے گہری واقفیت نہیں ہوتی وہ اسی نہج پر سوچنے لگتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ مساجد اور مدارس کی تعمیر میں حصّہ لیا جاتے اور نماز اور روزے اور حج اور زکوٰۃ کی کسی حد تک پابندی کر لی جاتے۔ باقی رہے دولت کمانے کے ناجائز ذرائع، معاشرے کا اخلاقی بگاڑ، مظلوموں اور کمزوروں پر ظالموں کی دراز دستیاں، اور نظامِ حکومت کی وہ خرابیاں جن کی بدولت ایک غیر اسلامی تہذیب فروغ پا رہی ہے، تو یہ "سیاست" کی باتیں ہیں جن سے تعرّض کرنا خدا کو راضی کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ان سے کوئی دلچسپی لیے بغیر وہ دولت کے حصُول کے لیے ہر طرح کے ناجائز ذرائع استعمال کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں اور حکومت اگر انہیں یہ آسانیاں بہم پہنچاتی رہے تو اس کی حمایت پر ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ براہِ راست تو دین کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتے لیکن ان کے طرزِ عمل سے دین کو اچھا خاصا نقصان پہنچتا ہے۔

ایک اور طبقہ وہ ہے جو محض اپنی چودھراہٹ کی خاطر برسرِ اقتدار طبقوں کے ساتھ مل کر دین کی راہ روکتا ہے۔ اِس طبقے میں سوائے جوڑ توڑ کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ ہر چڑھتے ہوئے سورج کا پرستار بن کر معاشرے میں عزت کا مقام حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرتا ہے۔ اس کا کوئی ضمیر اور ایمان نہیں ہوتا اور اس کا قبلہ ہر وقت بدلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ عوام بھی اس کی قدر و قیمت اچھی طرح پہچانتے ہیں اور

(باقی ص ۶۳ پر)

اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود یہ کتاب بڑی قابل قدر ہے۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نے بڑی محنت سے اسے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا ہے۔

بقیہ اشارات

حکمران بھی اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی ساکھ سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں مطلب برآری کی خاطر اسے اہمیّت دیتے ہیں۔ عوام اس کی طرف اس لیے رجوُع کرتے ہیں کہ یہ حکومت سے ان کے بعض ناجائز کام نکلوا لینے میں اُن کی مدد کرتا ہے۔ اور حکمران بوقت ضرورت اس سے اپنی حمایت حاصل کرتے ہیں۔ یہ طبقہ کبھی کسی معاملے میں مخلص نہیں ہوُا۔ اور اس کی وفاداریاں کبھی کسی کے ساتھ وابستہ نہیں رہیں۔ آزادی سے پہلے جب انگریز اور اس کی بنائی ہوئی سیاسی جتھے بندیوں کا غلبہ تھا۔ یہ طبقہ اُن کے ساتھ رہا۔ غیر ملکی اقتدار رخصت ہونے سے پہلے جب مسلم لیگ برسرِ اقتدار آتی نظر آئی تو یہ اُس کی صفوں میں آگھُسا۔ پھر جب مسلم لیگ کے ہاتھ سے زمامِ کار نکل گئی تو جس جس کی طرف اقتدار منتقل ہوتا رہا، یہ طبقہ بھی اس کا حاشیہ بردار بنتا چلا گیا۔ اور اب یہ کنونشن لیگ کی عقیدت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے۔ کسی جماعت یا فرد کے ساتھ یہ کتنا مخلص ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سکندر مرزا کے دورِ اقتدار میں جو لوگ ری پبلکن پارٹی کی محبت کا دم بھر رہے تھے، صدر محمد ایّوب خاں کے برسرِ اقتدار آتے ہی انہوں نے اُس سے آنکھیں پھیر لیں اور اس پارٹی کی لاش بے گور و کفن ہی پڑی رہ گئی۔ آج تک کسی نے اس غریب کی تجہیز و تکفین بھی نہ کی۔ اس طبقہ کے افراد جس طنطنے کے ساتھ موجودہ حکمرانوں کے حق میں صبح و شام جو بیان دے رہے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ عوام کے کان اُن سے مانوس ہی نہیں بلکہ انہیں سُن سُن کر پک گئے ہیں۔ صرف ممدوحوں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ مدح و ستائش کے الفاظ میں

کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

یہ بیانات ہم نے مرحوم لیاقت علی خان کے حق میں سنے۔ پھر یہی غلام محمد اور سکندر مرزا کے عہد میں سنے گئے۔ اور اب یہی ہم جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی تعریف میں سُن رہے ہیں۔ ایک ہی طبقہ ہر عہد میں ایک ہی نوعیت کا قصیدہ پڑھتا ہوا سنائی دیتا ہے یہ وہ طبقہ ہے جو کبھی کسی نظامِ صالح کے قیام میں مددگار نہیں بن سکتا۔

دین کی راہ روکنے کے لیے جو مختلف طبقے کام کر رہے ہیں ان میں بعض گمراہ فرقے اور گروہ بھی پیش پیش ہیں اور پُوری قوت کے ساتھ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلم ممالک میں کسی طرح دینِ حق غالب نہ ہونے پائے۔ یہ اگرچہ کھُل کر یہ بات تو نہیں کہتے لیکن ان کی سرگرمیوں اور اُن کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دینِ حق کے تسلّط کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیشہ اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ مختلف حیلوں بہانوں سے دین کی راہ روکی جائے۔ جب کبھی دینی تحریکات اور اُن کے علمبرداروں پر حکومتیں یا برسرِ اقتدار طبقے دستِ ظلم دراز کرتے ہیں تو انہیں بے حد خوشی ہوتی ہے اور یہ اُن کی کھُل کر تائید کرتے ہیں اور انہیں مزید ظلم ڈھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان گمراہ فرقوں کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام ہی کے سائے میں پرورش پا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام اگر قائم ہو گیا اور اس کی وجہ سے عوام کے اندر صحیح دینی احساس اور شعور پیدا ہو گیا تو پھر ان کے لیے اپنے گمراہ کن نظریات پھیلانا ممکن نہ رہے گا۔ اس بنا پر یہ سارے گروہ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں سخت مزاحم ہوتے ہیں اور جو لوگ بھی انہیں اس کے لیے کوشش کرتے نظر آتے ہوں اُن کے خلاف یہ ہمیشہ ایک مہم جاری رکھتے ہیں۔ ان گروہوں کا بھی بدقسمتی سے حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ ہے جس سے کام لے کر پوری قوت کے ساتھ دین کی راہ روک رہے ہیں۔